چوگانِ ہستی

1

شہر امیروں کے رہنے اور خرید و فروخت کرنے کی جگہ ہے اور دامن شہر ان کے سیر و تفریح کا مقام۔ وسط شہر میں ان کے لڑکوں کے مدرسے اور ان کی مقدمہ بازیوں کے وہ اکھاڑے ہوتے ہیں، جہاں انصاف کے بہانے غریبوں کا گلا گھونٹا جاتا ہے۔ شہر کے آس پاس غریبوں کی بستیاں ہوتی ہیں۔ بنارس میں پانڈے پورا اسی قسم کی آبادی ہے۔ وہاں نہ شہر کے لیمپوں کی شعاعیں پہنچتی ہیں نہ شہری چھڑکاؤ کی چھینٹیں اور نہ آب رسانی کے نلوں کی روانیاں لب سڑک چند چھوٹے چھوٹے بنیوں اور حلوائیوں کی دکانیں ہیں جن کے عقب میں کئی یکہ بان، گاڑی والے، گویے اور مزدور رہتے ہیں۔ دو چار گھر بگڑے ہوئے سفید پوشوں کے بھی ہیں جن کی خستہ حالی نے انہیں شہر سے خارج کر دیا ہے۔ یہیں ایک غریب اندھا چمار بھی رہتا ہے، جسے لوگ سور داس کہتے ہیں۔ ہندوستان میں اندھے آدمیوں کے لیے نہ نام کی ضرورت ہوتی ہے نہ کام کی۔ سور داس ان کا بنا بنایا نام ہے اور بھیک مانگنا ان کا بنا بنایا کام۔ ان کے اوصاف و عادات بھی مشہور زمانہ ہیں۔ گانے بجانے سے ایک خاص دلچسپی، دل میں ایک خاص محبت، روحانیت اور بھگتی سے ایک خاص رغبت ان کی فطرتی اطوار ہیں۔ نگاہ ظاہر بند اور نگاہ باطن کھلی ہوئی۔

سور داس ایک نہایت نحیف و ناتواں اور سادہ مزاج شخص تھا، جسے شاید قدرت نے بھیک مانگنے ہی کے لیے بنایا تھا۔ وہ ہر روز لاٹھی ٹیکتا ہوا پکی سڑک پر آ بیٹھتا اور راہ گیروں کی جان کی خیر مناتا ''داتا بھگوان تمہارا کلیان کریں'' یہی اس کی صدا تھی اور اسی کو وہ بار بار دہراتا تھا۔ شاید وہ اسے مسافروں کے تالیف قلوب منتر سمجھتا تھا پا پیادہ مسافروں کو وہی اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے دعائیں دیتا تھا۔ لیکن جب کوئی یکہ گزرتا تو وہ اس کے پیچھے دوڑنے لگتا اور بگھیوں کے ساتھ تو گویا اس کے پیروں میں پر لگ جاتے تھے، لیکن موٹروں کو وہ اپنے نیک ارادوں کے پرے سمجھتا تھا۔ تجربہ نے اس کو بتلا دیا تھا کہ ہوا گاڑیاں کسی کی

باتیں نہیں سنتیں۔ صبح سے شام تک اس کا تمام وقت دعائے خیر ہی میں گزرتا تھا۔ یہاں تک کہ ماگھ پوس کے ابرو باد اور بیساکھ جیٹھ کی سوز و تپش میں بھی ناغہ نہ ہوتا تھا۔

کاتک کا مہینہ تھا۔ ہوا میں خوش گوار خنکی آ گئی تھی۔ شام کا وقت تھا۔ سورداس اپنی جگہ پر بت کی طرح بیٹھا ہوا کسی یکہ یا بگھی کی صدائے خوش آئند پر کان لگائے ہوئے تھا۔ سڑک پر دو رویہ درختوں کی قطاریں تھیں۔ ان کے نیچے گاڑی بانوں نے گاڑیاں ٹھہرا دیں اور بیل کھول دیئے۔ پچھائیں بیل ٹاٹ کے ٹکڑوں پر کھلی اور بھوسہ کھانے لگے۔ گاڑی بانوں نے بھی اپلے جلا دیے۔ کوئی چادر پر آٹا گوندھتا تھا۔ کوئی گول باٹیاں بنا کر اوپلوں پر سینکتا تھا۔ کسی کو برتنوں کی ضرورت نہ تھی۔ سالن کے لیے گھوئیوں کا بھرتہ کافی تھا اور اس بے سروسامانی پر بھی انہیں کوئی فکر نہ تھی۔ بیٹھے ہوئے باٹیاں سینکتے اور گاتے جاتے تھے۔ بیلوں کے گلے کی گھنٹیاں ساز کا کام دے رہی تھیں۔ گنیش گاڑی بان نے سورداس سے پوچھا ''کیوں بھگت! بیاہ کرو گے؟''

سورداس نے گردن ہلا کر کہا ''کہیں ہے ڈول؟''

گنیش: ''ہاں ہے کیوں نہیں؟ ایک گاؤں میں ایک سوریا ہے۔ تمہاری ہی جات برادری کی ہے۔ کہو تو بات چیت پکی کروں۔ تمہاری بارات میں مزہ سے دو دن باٹیاں لگیں۔''

سورداس: کوئی ایسی جگہ بتائی جہاں دھن ملے اور اس بھیک منگائی سے پیچھا چھوٹے۔ ابھی اپنے ہی پیٹ کی فکر ہے۔ تب ایک اندھی کی اور فکر ہو جائے گی۔ ایسی بیڑی پیر میں نہیں ڈالتا۔ بیڑی ہی ہے تو سونے کی تو ہو!

گنیش: لاکھ روپے کی مہریا نہ پا جاؤ گے۔ رات کو تمہارے پاؤں دبانے گی، سر میں تیل ڈالے گی، ایک بار پھر جوان ہو جاؤ گے۔ یہ ہڈیاں نہ دکھائی دیں گی۔

سورداس: تو روٹیوں کا سہارا بھی جاتا رہے گا۔ یہ ہڈیاں دیکھ کر ہی تو لوگوں کو دیا آتی ہے۔ موٹے آدمیوں کو بھیک کون دیتا ہے، الٹا اور طعنے ملتے ہیں۔

گنیش: اجی نہیں، وہ تمہاری سیوا بھی کرے گی اور تمہیں بھوجن بھی دے گی۔ بچن ساہ کے یہاں تلہن جھاڑے گی تو چار آنے روز پائے گی۔

سورداس: تب تو اور بھی درگت ہوگی۔ گھر والی کی کمائی کھا کر کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہ رہوں گا۔

دفعتاً ایک فٹن آتی ہوئی سنائی دی۔ سورداس لاٹھی ٹیک کر اٹھ کھڑا ہوا۔ یہی اس کی کمائی کا وقت تھا۔ اسی وقت شہر کے رئیس اور مہاجن ہوا خوری کو آتے تھے۔ فٹن جوں ہی سامنے آئی، سورداس اس کے پیچھے ''داتا بھگوان تمہارا کلیان کرے'' کہتا ہوا دوڑا۔

فٹن میں جائے صدر پر مسٹر جان سیوک اور ان کی اہلیہ مسز جان سیوک بیٹھی ہوئی تھیں۔ مقابل میں ان کا جوان لڑکا پربھو سیوک اور اس کی چھوٹی بہن مس صوفیہ سیوک تھی۔ جان سیوک دوہرے بدن کے گورے چٹے آدمی تھے۔ بڑھاپے میں بھی چہرہ سرخ تھا۔ سر اور ڈاڑھی کے بال کھچڑی ہو گئے تھے۔ وضع انگریزی تھی جوان پر خوب موزوں تھی۔ چہرہ پر غرور اور خودداری کا رنگ جھلکتا تھا۔ مسز سیوک کو وقت کے ہاتھوں نے زیادہ ستایا تھا۔ چہرہ پر جھریاں پڑ گئی تھیں اور اس سے ان کی تنگ دلی کا اظہار ہوتا تھا، جس کو سنہری عینک بھی نہ چھپا سکتی تھی۔ پر بھو سیوک کی مسیں بھیگ رہی تھیں۔ چھریرا اور اکہرا بدن، زرد رو آنکھوں پر عینک اور چہرہ پر متانت اور غور و خوض کا گہرا رنگ نظر آتا تھا۔ آنکھوں سے ایک نور ترحم نمودار تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ حسن قدرت سے لطف اٹھا رہا ہے۔ مس صوفیہ بڑی بڑی آنکھوں والی، شرمیلی نازنین تھی۔ نازک اندام اس قدر گویا عناصر کے بجائے پھولوں سے وجود پذیر ہوئی تھی۔ چہرہ ایسا موزوں گویا شرم و انکسار کا مجسمہ تھا۔ وہ سراپا روح تھی۔ مادیت کا کہیں پتہ نہ تھا۔

سورداس فٹن کے پیچھے دوڑتا چلا آتا تھا۔ اتنی دور تک اور تیزی سے کوئی مشاق کھلاڑی بھی نہ دوڑ سکتا تھا۔ مسز سیوک نے ناک سکوڑ کر کہا ''اس کم بخت کی چیخ نے تو کانوں کے پردے پھاڑ ڈالے۔ کیا یہ دوڑتا ہی چلا جائے گا؟''

مسٹر جان سیوک بولے ''اس ملک کے سر سے یہ بلا نہ جانے کب جائے گی؟ جس ملک میں بھیک مانگنا بے شرمی میں داخل نہ ہو۔ یہاں تک کہ اونچی سے اونچی ذاتیں بھی اسے کسب معاش کا ذریعہ بنائیں۔ جہاں مہاتماؤں کے گذر بسر کا بھی صرف یہی ایک سہارا ہو، اس ملک کی نجات کے لیے ابھی صدیوں کی مدت درکار ہے''

پربھو سیوک: یہاں یہ رواج زمانہ قدیم سے چلا آتا ہے۔ زمانہ سلف میں راجاؤں کے لڑکے بھی درس گاہوں میں پڑھتے وقت بھیک مانگ کر اپنی نیز اپنے استادوں کی پرورش کرتے تھے۔ علماء وفقرا کے لیے بھی یہ کوئی بے عزتی کی بات نہ تھی۔ مگر وہ لوگ مکروہات دنیا سے الگ ہو کر تلاش حق میں مصروف رہتے تھے۔ اس رواج کو اب بیجا طریقہ پر برتا جا رہا ہے۔ میں نے یہاں تک سنا ہے کہ کتنے ہی برہمن جو زمیندار ہیں، گھر سے خالی ہاتھ مقدمہ بازی کرنے چلتے ہیں۔ دن بھر کبھی لڑکی کے بیاہ کے حیلہ سے، کبھی کسی عزیز کی موت کے بہانے سے بھیک مانگتے ہیں۔ شام کو اناج بیچ کر پیسے کھرے کر لیتے ہیں۔ پیسے جلد روپے بن جاتے ہیں اور بالآخر وہ وکیلوں اور کچہری کے عملوں کی جیبوں میں چلے جاتے ہیں۔

مسز سیوک: سائیس! اس اندھے سے کہہ دے۔ بھاگ جائے۔ پیسے نہیں ہیں۔

مس صوفیہ: نہیں ماما! پیسے ہوں تو دے دیجیے، بیچارہ نصف میل سے دوڑا چلا آ رہا ہے۔ مایوس ہو جائے گا۔ اس کی آتما کو کتنا دکھ ہوگا۔

مسز سیوک: تو یہاں اس سے کس نے دوڑنے کے لیے کہا تھا؟ اس کے پیروں میں درد ہوتا ہوگا!

صوفیہ: نہیں، اچھی ماما! کچھ دے دیجیے، بیچارہ کتنا ہانپ رہا ہے۔

پربھو سیوک نے جیب سے کیس نکالا، مگر تانبے یا نکل کا کوئی ٹکڑا نہ نکلا اور چاندی کا کوئی سکہ دینے میں ماں کی ناراضگی کا اندیشہ تھا۔ بہن سے بولے ''صوفی! افسوس ہے پیسے نہیں نکلے۔ سائیس! اندھے سے کہہ دو۔ آہستہ آہستہ آگے والے گودام تک چلا جائے،

وہاں شاید پیسے مل جائیں۔''

مگر سورداس کو اتنا صبر کہاں؟ جانتا تھا گودام پر کوئی میرے لیے کھڑا نہ رہے گا۔ کہیں گاڑی آگے بڑھ گئی تو اتنی محنت بیکار ہو جائے گی۔ اس نے گاڑی کا پیچھا نہ چھوڑا اور پورے ایک میل تک دوڑتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ گودام آ گیا اور فٹن رکی۔ سب لوگ اتر پڑے۔ سورداس بھی ایک طرف کھڑا ہو گیا جیسے درختوں کے بیچ میں ٹھٹھ ہا نپتے ہا نپتے بیدم ہو رہا تھا۔

مسٹر جان سیوک نے یہاں چمڑے کی آڑھت کھول رکھی تھی۔ طاہر علی نامی ایک شخص ان کا ایجنٹ تھا۔ وہ برآمدہ میں بیٹھا ہوا تھا۔ صاحب کو دیکھتے ہی اس نے اٹھ کر سلام کیا۔

جان سیوک نے پوچھا کہیے خاں صاحب! چمڑے کی آمدنی کیسی ہے؟

طاہر علی: حضور! ابھی جیسی ہونی چاہیے ویسی تو نہیں ہے مگر امید ہے کہ آئندہ اچھی ہو۔

جان سیوک: کچھ دوڑ دھوپ کیجیے۔ ایک ہی جگہ بیٹھے رہنے سے کام نہ چلے گا۔ قرب و جوار کے دیہاتوں میں چکر لگایا کیجیے۔ میرا ارادہ ہے کہ میونسپلٹی کے چیئرمین صاحب سے مل کر یہاں ایک شراب اور تاڑی کی دکان کھلوا دوں۔ اس وقت آس پاس کے چمار یہاں روز آئیں گے اور آپ کو ان سے ربط ضبط پیدا کرنے کا موقع ملے گا۔ آج کل ان چالوں کے بغیر کسی کاروبار کو فروغ نہیں ہو سکتا۔ مجھی کو دیکھئے۔ ایسا شاید ہی کوئی دن جاتا ہو گا کہ میں شہر کے دو چار بڑے آدمیوں سے ملاقات نہ کرتا ہوں۔ دس ہزار کی بھی ایک پالیسی مل گئی تو ہفتوں کی دوا دوش کی محنت ٹھکانے لگ گئی۔

طاہر علی: حضور! مجھے خود فکر ہے۔ سوچتا ہوں کہ کاروبار میں مالک کو چار پیسے کا نفع نہ ہو گا تو وہ اس کام کو کرے گا کیوں؟ مگر حضور نے میری جو تنخواہ مقرر کی ہے، اس میں گزر نہیں ہوتا۔ گھر کے لیے تو بیس روپے کا اناج بھی کافی نہیں ہوتا اور سب ضروریات اس کے علاوہ۔ ابھی کہنے کی ہمت نہیں پڑتی مگر حضور سے نہ کہوں تو کس سے کہوں؟

جان سیوک: کچھ دن کام کیجیے۔ ترقی ہو گی نا۔ کہاں ہے آپ کا حساب کتاب؟

لائیے! دیکھوں۔

یہ کہتے ہوئے مسٹر جان سیوک گودام کے برآمدے میں ایک ٹوٹے ہوئے مونڈھے پر بیٹھ گئے۔ مسز سیوک ایک کرسی پر متمکن ہوئیں۔ طاہر علی نے بہی لاکر سامنے رکھ دی۔ صاحب اس کا معائنہ کرنے لگے۔ دو چار ورق الٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد ذرا بگڑ کر بولے ''ابھی آپ کو حساب کتاب رکھنے کا سلیقہ نہیں ہے۔ اس پر آپ فرماتے ہیں کہ ترقی کر دیجیے۔ حساب بالکل آئینہ ہونا چاہیے۔ یہاں تو کچھ پتہ نہیں چلتا کہ آپ نے کتنا مال خریدا اور کتنا روانہ کیا۔ خریدار کو فی کھال ایک آنہ دستوری ملتی ہے۔ وہ کہیں درج نہیں ہے۔''

طاہر علی: کیا اسے بھی درج کروں؟

جان سیوک: کیوں نہیں؟ کیا وہ بھی میری ہی آمدنی نہیں ہے؟

طاہر علی: میں نے سمجھا تھا وہ مجھ خادم کا حق ہے۔

جان سیوک: ہرگز نہیں! میں آپ پر غبن کا مقدمہ دائر کر سکتا ہوں (تیور بدل کر) ملازموں کا حق ہے! خوب! آپ کا حق ہے تنخواہ اس کے سوال آپ کا کوئی حق نہیں ہے۔

طاہر علی: حضور! اب آئندہ ایسی غلطی نہ ہوگی۔

جان سیوک: اب تک اس مد میں آپ نے جو رقم وصول کی ہے، وہ آمدنی میں دکھائیے۔ حساب کتاب کے معاملہ میں میں ذرا بھی رعایت نہیں کرتا۔

طاہر علی: حضور! بہت قلیل رقم ہوگی۔

جان سیوک کچھ مضائقہ نہیں۔ ایک ہی پائی سہی۔ یہ سب آپ کو بھرنے پڑے گی۔ ابھی وہ رقم قلیل ہے۔ کچھ دنوں میں اس کی تعداد سینکڑوں تک پہنچ جائے گی۔ اس رقم سے میں یہاں ایک سنڈے اسکول کھول سکتا ہوں۔ سمجھ گئے۔ میم صاحب کی یہ بڑی زبردست خواہش ہے اچھا چلیے وہ زمین کہاں ہے جس کا آپ نے ذکر کیا تھا؟

گودام کے عقب میں ایک وسیع میدان تھا۔ یہاں قرب و جوار کے مواشی چرنے جایا

کرتے تھے۔ جان سیوک اس زمین کو خرید کر وہاں ایک سگریٹ بنانے کا کارخانہ کھولنا چاہتے تھے۔ انہوں نے پربھوسیوک کو بھی ہنر سیکھنے کے لیے امریکہ بھیجا تھا۔ جان سیوک کے ساتھ پربھوسیوک اور ان کی ماں بھی زمین کو دیکھنے چلے۔ باپ بیٹے نے مل کر اراضہ کی پیائش کی۔ کہاں کارخانہ ہوگا، کہاں گودام، کہاں دفتر، کہاں مینجر کا بنگلہ، کہاں مزدوروں کی بارکیں، کہاں کوئلہ رکھنے کی جگہ اور کہاں سے پانی سے آئے گا وغیرہ کے متعلق باپ بیٹے میں دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ بالآخر مسٹر سیوک نے طاہر علی سے پوچھا ''یہ کس کی زمین ہے؟''

طاہر علی: حضور یہ تو ٹھیک نہیں معلوم۔ ابھی چل کر یہاں کسی دے دریافت کرلوں گا۔ شاید نائک رام پنڈا کی ہو۔

جان سیوک: آپ اس سے یہ زمین کتنے میں دلا سکتے ہیں؟

طاہر علی: مجھے تو اس میں بھی شک ہے کہ کیا وہ اسے بیچے گا بھی

جان سیوک: اجی! بیچے گا اس کا باپ! اس کی کیا ہستی ہے؟ روپے کے سترہ آنے دیجیے اور آسمان کے تارے منگوا لیجیے۔ آپ اسے میرے پاس بھیج دیجیے۔ میں خود باتیں کرلوں گا۔

پربھوسیوک: مجھے تو اندیشہ ہے کہ یہاں خام جنس بمشکل مل سکے گی۔ اس طرف تمباکو کی کاشت کم کرتے ہیں۔

جان سیوک: کچا مال پیدا کرنا تمہارا کام ہوگا۔ کاشتکار کو رکھ جو یا گیہوں سے عشق نہیں ہوتا۔ وہ جس چیز میں اپنا فائدہ دیکھے گا، وہی پیدا کرے گا۔ اس کا کچھ اندیشہ نہیں ہے (طاہر علی سے) خاں صاحب! آپ اس پنڈے کو میرے پاس کل ضرور بھیج دیجیے گا۔

طاہر علی: بہت خوب! اس سے کہوں گا

جان سیوک: کہوں گا نہیں، اس کو بھیج دیجیے گا۔ اگر آپ سے اتنا بھی نہ ہوسکا تو میں سمجھوں گا کہ آپ کو معاملہ بندی کا مطلق شعور نہیں۔

مسز سیوک: (انگریزی میں) تمہیں اس جگہ پر کوئی تجربہ کار آدمی رکھنا چاہیے تھا۔

جان سیوک: (انگریزی میں) نہیں میں تجربہ کار آدمی سے ڈرتا ہوں۔ وہ اپنے تجربہ سے اپنا فائدہ سوچتا ہے۔ تمہیں فائدہ نہیں پہنچاتا۔ میں تجربہ کاروں سے کوسوں دور رہتا ہوں۔

اس طرح باتیں کرتے ہوئے چاروں آدمی فٹن کے پاس آئے۔ یہاں صوفیہ کھڑی ہوئی سورداس سے باتیں کر رہی تھی۔ پربھو سیوک کو دیکھتے ہی انگریزی میں بولی ''پربھو! یہ اندھا تو کوئی گیانی آدمی معلوم ہوتا ہے۔ پورا فلاسفر ہے۔''

مسز سیوک: تو جہاں جاتی ہے وہیں تجھے کوئی نہ کوئی گیانی آدمی مل جاتا ہے۔ کیوں بے اندھے! تو بھیک کیوں مانگتا ہے؟ کوئی کام کیوں نہیں کرتا؟

صوفیہ: (انگریزی میں) ماما! یہ اندھا بالکل گنوار نہیں ہے۔

سورداس کو صوفیہ سے عزت پانے کے بعد یہ توہین آمیز الفاظ بہت برے معلوم ہوئے۔ اپنی عزت کرنے والوں کے سامنے اپنی ہتک کئی گنا ناقابل برداشت ہو جاتی ہے۔ وہ سر اٹھا کر بولا: ''بھگوان نے جنم دیا ہے۔ بھگوان کی چاکری کرتا ہوں۔ کسی دوسرے کی تابعداری اب نہیں ہو سکتی۔''

مسز سیوک: تیرے بھگوان نے تجھے اندھا کیوں بنا دیا؟ اس لیے کہ تو بھیک مانگتا پھرے؟ تیرا بھگوان بڑا بے انصاف ہے

صوفیہ: (انگریزی میں) ماما! آپ اس کی اتنی بے عزتی کر رہی ہیں کہ مجھے شرم آتی ہے۔

سورداس: بھگوان بے انصاف نہیں میرے پہلے جنم کی کمائی ہی ایسی تھی۔ جیسے کرم کیے ہیں ویسا پھل بھوگ رہا ہوں۔ یہ سب بھگوان کی لیلا ہے۔ وہ بڑا کھلاڑی ہے۔ گھروندے بناتا بگاڑتا رہتا ہے۔ اس کو کسی سے عداوت نہیں ہے۔ وہ کیوں بے انصافی کرنے لگا؟

صوفیہ: میں اگر اندھی ہوتی تو خدا کو کبھی معاف نہ کرتی

سورداس: میم صاحب! اپنے پاپ سب کو آپ بھوگنے پڑتے ہیں۔ بھگوان کا اس میں کوئی دوش نہیں۔

صوفیہ: ماما! یہ راز میری سمجھ میں نہیں آتا۔ اگر خداوند یسوع نے ہمارے گناہوں کا کفارہ اپنے خون سے کر دیا تو پھر سارے عیسائی ایک ہی حالت میں کیوں نہیں ہیں؟ دیگر مذاہب والوں کی طرح ہماری قوم میں بھی امیر، غریب، اچھے، برے، لنگڑے، لولے سبھی طرح کے لوگ موجود ہیں۔ اس کا کیا سبب ہے؟

مسز سیوک نے ابھی کوئی جواب نہ دیا تھا کہ سورداس بول اٹھا ''میم صاحب! اپنے گناہوں کا کفارہ ہمیں آپ کرنا پڑتا ہے۔ اگر آج معلوم ہو جائے کہ کسی نے ہمارے گناہوں کے بار کو اپنے سر لے لیا تو دنیا میں اندھیرا ہو جائے''

مسز سیوک: صوفی! مجھے سخت افسوس ہے کہ اتنی موٹی سی بات تیری سمجھ میں نہیں آتی۔ حالانکہ ریورنڈ پم نے خود کئی بار تیرے شکوک کا دفعیہ کیا ہے۔

پربھو سیوک: (سورداس سے) تمہارے خیال میں ہم لوگوں کو بیراگی ہو جانا چاہیے؟ کیوں؟

سورداس: ہاں جب تک ہم بیراگی نہ ہوں گے۔ ہم دکھوں سے نہیں بچ سکتے۔

جان سیوک: بدن پر راکھ مل کر بھیک مانگنا خود ہی سب سے بڑا دکھ ہے۔ یہ ہم کو دکھوں سے کیونکر نجات دلا سکتا ہے؟

سوداس: صاحب! بیراگی ہونے کے لیے راکھ ملنے اور بھیک مانگنے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے مہاتماؤں نے راکھ ملنے اور جٹا بڑھانے کو تو محض ڈھکوسلا بنا دیا ہے۔ بیراگ تو من سے ہوتا ہے۔ سنسار میں رہے مگر سنسار کا ہو کر نہ رہے۔ اسی کو بیراگ کہتے ہیں۔

مسز سیوک: ہندوؤں نے یہ باتیں یونان کے اسٹوئک نامی فرقہ سے سیکھی ہیں، لیکن یہ نہیں سمجھتے کہ ان پر کاربند ہونا کتنا مشکل ہے۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ انسان پر رنج و مسرت کا

اثر نہ پڑے۔ اسی اندھے کو اگر اس وقت پیسے نہ ملیں تو اپنے دل میں ہمیں ہزاروں صلواتیں سنائے گا۔

جان سیوک: ہاں اسے کچھ مت دو۔ دیکھو کیا کہتا ہے۔ اگر ذرا بھی بھنبھنایا تو میں ہنٹر سے باتیں کروں گا۔ سارا بیراگ بھول جائے گا۔ مانگتا ہے بھیک ایک ایک دھیلے کے لیے میلوں کتے کی طرح دوڑتا ہے۔ اس پر غرہ یہ ہے کہ میں بیراگی ہوں (کوچوان سے) گاڑی بھیرو کلب ہوتے ہوئے بنگلے چلو۔

صوفیہ: ماما! کچھ تو ضرور دے دو! بے چارہ امیدیں باندھ کر اتنی دور دوڑا آیا ہے۔

پربھو سیوک: اوہو! مجھے تو پیسے بھنانے کی یاد ہی نہ رہی!

جان سیوک: ہرگز نہیں، کچھ مت دو، میں اسے بیراگ کا سبق دینا چاہتا ہوں۔

گاڑی روانہ ہوئی سورداس مایوسی کا مجسمہ بنا ہوا اپنی اندھی آنکھوں سے گاڑی کی طرف تاکتا رہا۔ گویا اس کو اب بھی یقین نہ ہوتا تھا کہ کوئی انسان اتنا بے رحم ہو سکتا ہے۔ وہ اسی نیم یقینی کی حالت میں گاڑی کے پیچھے پیچھے کئی قدم چلا بھی۔ دفعتاً صوفیا نے کہا: ''سورداس! افسوس کہ اس وقت میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ پھر کبھی ادھر آؤں گی تو تم کو اس قدر مایوس نہ ہونا پڑے گا۔''

اندھوں میں فراست کا مادہ کافی ہوتا ہے۔ سورداس موجودہ کیفیت کو بخوبی سمجھ گیا۔ دل کو تکلیف تو ہوئی مگر بے پروائی سے بولا ''میم صاحب! اس کی کیا فکر؟ بھگوان تمہاری کلیان کریں۔ تمہاری دیا چاہیے۔ میرے لیے یہی بہت ہے''

صوفیہ نے ماں سے کہا ''ماما! دیکھا آپ نے؟ اس کی طبیعت ذرا مکدر نہیں ہوئی''

پربھو سیوک: ہاں رنجیدہ تو نہیں معلوم ہوتا

جان سیوک: اس کے دل سے پوچھو

مسز سیوک: گالیاں دے رہا ہوگا

گاڑی ابھی آہستہ آہستہ چل رہی تھی کہ طاہر علی نے پکارا ''حضور یہ زمین پنڈا کی نہیں

بلکہ سورداس کی ہے یہ لوگ کہہ رہے ہیں''

صاحب نے گاڑی روک دی۔ شرمندہ نظری سے مسٹر سیوک کو دیکھا۔ گاڑی سے اتر کر سورداس کے پاس آئے اور منکسرانہ انداز سے بولے'' کیوں سورداس؟ یہ زمین تمہاری ہے؟''

سورداس: ہاں حضور! میری ہی ہے۔

جان سیوک: تو میرا کام بن گیا۔ میں اندیشہ میں تھا کہ نہ جانے اس کا مالک کون ہے اور اس سے معاملہ طے بھی ہوگا یا نہیں۔ جب تمہاری ہے تو پھر کوئی اندیشہ نہیں۔ تم جیسے تارک الدنیا اور نیک شخص سے زیادہ جھنجھٹ نہ کرنا پڑے گا۔ جب تمہارے پاس اتنی زمین ہے تو تم نے یہ بھیس کیوں بنا رکھا ہے؟

سورداس: کیا کروں حضور بھگوان کی جو مرضی ہے وہ کر رہا ہوں۔

جان سیوک: تو اب تمہاری مصیبت دور ہو جائے گی۔ بس یہ زمین مجھے دے دو۔ بھلائی کی بھلائی اور فائدہ کا فائدہ میں تم کو منہ مانگی قیمت دوں گا۔

سورداس: سرکار! بزرگوں کی یہی نشانی ہے۔ اسے بیچ کر ان کو کیا منہ دکھاؤں گا؟

جان سیوک: یہیں سڑک پر ایک کنواں بنا دوں گا۔ تمہارے پرکھوں کا نام اس سے چلتا رہے گا۔

سورداس: صاحب اس زمین سے محلّہ والوں کا بہت فائدہ ہوتا ہے۔ کہیں ایک انگل بھر چراگاہ نہیں ہے۔ قرب و جوار کے کل مویشی یہیں چرنے آتے ہیں۔ فروخت کر ڈالوں گا تو مویشیوں کے لیے کوئی ٹھکانا نہ رہ جائے گا۔

جان سیوک: کتنے روپے سالانہ چرائی کے پاتے ہو؟

سورداس: کچھ نہیں مجھے بھگوان کھانے بھر کو یوں ہی دے دیتے ہیں تو کسی سے چرائی کیا لوں؟ کسی اور کچھ بھلائی نہیں کر سکتا تو اتنی ہی سہی۔

جان سیوک: (تعجب سے) تم نے اتنی زمین یوں ہی چرائی کے لیے چھوڑ رکھی ہے۔

صوفیہ سچ کہتی تھی کہ تم تیاگ کی مورت ہو۔ میں نے بڑوں بڑوں میں اتنا تیاگ نہیں دیکھا۔تم کو آفرین ہے لیکن جب مویشیوں پر اتنی دیا کرتے ہوتو انسان وک کس طرح مایوس کرو گے؟ میں یہ زمین لیے بغیر تمہارا گلا نہ چھوڑوں گا۔

سورداس: سرکار! یہ زمین میری ہے ضرور، لیکن جب تک محلّہ والوں سے پوچھ نہ لوں، کچھ کہہ نہیں سکتا۔ آپ اس کو لے کر کیا کریں گے؟

جان سیوک: یہاں ایک کارخانہ کھولوں گا جس سے ملک وقوم کی ترقی ہوگی۔غریبوں کا فائدہ وہ گا۔ہزاروں آدمیوں کی روٹیاں چلیں گی۔اس کا ثواب بھی تمہیں کو ہوگا۔

سوداس: حضور! محلّہ کے لوگوں سے دریافت کیے بغیر میں کچھ نہیں عرض کرسکتا۔

جان سیوک: اچھی بات ہے پوچھ لو میں پھر تم سے ملوں گا اتنا سمجھ رکھو کہ میرے ساتھ سودا کرنے میں تم کو گھاٹا نہ رہے گا۔تم جس طرح خوش وہ گے، اسی طرح خوش کروں گا یہ لو (جیب سے پانچ روپے نکال کر) میں نے تم کو معمولی بھکاری سمجھ کر تمہاری توین کی تھی۔ پس مجھے معاف کرو۔

سورداس: حضور! میں روپے لے کر کیا کروں گا؟ دھرم کے ناتے دو چار پیسے دے دیجئے، تو آپ کا کلیان مناؤں گا اور کسی ناتے سے میں روپے نہ لوں گا۔

جان سیوک: تمہیں دو چار پیسے کیا دوں؟ اسے لے لو دھرم کے ناتے ہی سمجھو

سورداس: نہیں صاحب! دھرم میں آپ کی غرض شامل ہوگئی ہے۔اب یہ دھرم نہیں رہا۔

جان سیوک نے بہت اصرار کیا، لیکن سورداس نے روپے نہ لیے۔صاحب مجبور ہوکر گاڑی پر جا بیٹھے۔مسز سیوک نے پوچھا ''کیا باتیں ہوئیں؟''

جان سیوک: ہے تو فقیر لیکن بہت مغرور ہے۔پانچ روپے دیتا تھا نہ لیے

مسز سیوک: ہے کچھ امید؟

جان سیوک: جتنا آسان سمجھ رکھا تھا۔اتنا آسان نہیں ہے

گاڑی تیز ہوگئی۔

2

سورداس لاٹھی ٹیکتا ہوا آہستہ آہستہ گھر کی طرف چلا۔ راستہ میں چلتے چلتے سوچنے لگا۔ یہ ہے بڑے آدمیوں کی خودغرضی۔ پہلے کیسی شان دکھاتے تھے۔ مجھے کتے سے بھی بدتر سمجھا، لیکن جونہی ان کو معلوم ہوا کہ زمین میری ہے تو کیسی خوشامد آمیز گفتگو کرنے لگے۔ انہیں میں اپنی زمین دیئے دیتا ہوں! پانچ روپے دکھاتے تھے۔ گویا میں نے روپے دیکھے ہی نہیں! پانچ کیا پانچ سو بھی دیں تو میں زمین نہ دوں گا۔ محلّہ والوں کو کونسا منہ دکھاؤں گا۔ ان کے کارخانہ کے لیے بیچاری گائیں ماری ماری پھریں! عیسائیوں کو دیا دھرم کا ذرا بھی خیال نہیں ہوتا۔ بس سب کو عیسائی ہی بناتے پھرتے ہیں۔ کچھ نہ دینا تھا تو پہلے ہی جواب دے دیتے۔ میل بھر دوڑا کر کہہ دیا تھا چل ہٹ معلوم ہوتا ہے کہ ان سب میں لڑکی ہی کا سوبھاؤ اچھا ہے۔ اسی میں دیا دھرم ہے۔ بڑھیا تو پوری کرک سا ہے۔ سیدھے منہ بات نہیں کرتی۔ اتنا گھمنڈ! جیسے یہی وکٹوریہ ہیں! رام رام تھک گیا ابھی تک دم پھول رہا ہے۔ ایسا آج تک کبھی نہ ہوا تھا کہ اتنا دوڑ کر کسی نے کورا جواب دے دیا ہو۔ خیر بھگوان کی یہی اچھا ہوگی۔ اے دل! اتنا غم نہ کر مانگنا تمہارا کام ہے اور دینا دوسروں کا۔ اپنا دھن ہے کوئی نہیں دیتا تو تمہیں برا کیوں لگتا ہے؟ لوگوں سے کہہ دوں کہ صاحب زمین مانگتے ہیں؟ نہیں سب گھبرا جائیں گے۔ میں نے جواب تو دے ہی دیا۔ اب دوسروں سے کہنا فضول ہے۔

یہ سوچتا ہوا وہ اپنے دروازہ پر پہنچا۔ بہت ہی معمولی جھونپڑی تھی۔ سامنے ایک نیم کا درخت تھا۔ دروازہ پر کواڑوں کی جگہ بانس کی ٹہنیوں کی ایک ٹٹی لگی ہوئی تھی۔ سورداس نے ٹٹی ہٹائی۔ کمر سے پیسوں کی ایک چھوٹی پوٹلی نکالی، جو آج دن بھر کی کمائی تھی۔ پھر جھونپڑی کی چھت میں سے ٹٹول کر ایک تھیلی نکالی، جو اس کی زندگی کا ماحصل تھی۔ اس میں پیسوں کو بہت آہستہ سے رکھا کہ کسی کے کانوں میں بھنک نہ پڑے۔ ازاں بعد اس تھیلی کو چھت

میں چھپا کر پڑوس کے گھر سے آگ مانگ لایا۔ پیڑوں کے نیچے سے کچھ سوکھی ٹہنیاں جمع کر رکھی تھیں۔ انہیں سے چولہا جلایا۔ جھونپڑی میں دھندلی سی روشنی ہوئی۔ بے سروسامانی کا نظارہ کرنا دل شکن تھا! نہ کھاٹ نہ بستر نہ برتن نہ بھانڈے ایک گوشہ میں ایک مٹی کا گھڑا تھا جس کی عمر کا کچھ اندازہ اس پر جمی ہوئی کائی سے ہوسکتا تھا۔ چولہے کے پاس ایک ہانڈی تھی۔ پرانا اور سوراخوں سے چھلنی بنا ہوا ایک لوہے کا توا۔ ایک چھوٹی کٹھوت اور ایک لوٹا۔ بس یہی اس گھر کی ساری دولت تھی۔ انسانی خواہشات کا کتنا مکمل خلاصہ! سورداس نے آج جتنا اناج پایا تھا، وہ سب جوں کا توں ہانڈی میں ڈال دیا۔ کچھ جو تھے کچھ گیہوں، کچھ مٹر، کچھ چنے، تھوڑی سی جوار اور مٹھی بھر چاول اوپر سے قدرے نمک ڈال دیا۔ کس کی زبان نے ایسی غذائے لطیف و نفیس کا مزہ چکھا ہوگا؟ اس میں قناعت کی شیرینی تھی، جس سے شیریں تر دنیا میں کوئی چیز نہیں۔ ہانڈی کو چولہے پر چڑھا کر وہ گھر سے نکلا۔ دروازے پر ٹٹی لگائی اور سڑک پر جا کر ایک بنیے کی دکان سے تھوڑا سا آٹا اور ایک پیسہ کا گڑ لایا۔ آٹے کو کٹھوت میں گوندھا اور پھر نصف گھنٹہ تک چولہے کے سامنے کھچڑی کا دلکش ترانا سنتا رہا۔ اس دھندلی سی روشنی میں اس کا لاغر جسم اور اس کے بوسیدہ کپڑے انسانوں کی اس محبت کا مضحکہ اڑا رہے تھے، جو ان کو زندگی کے ساتھ فطرتاً ہوا کرتی ہے۔

ہانڈی میں کئی دفعہ ابال آیا اور کئی دفعہ آگ بجھی۔ بال بال چولہا پھونکتے پھونکتے سورداس کی آنکھوں سے پانی بہنے لگتا تھا۔ آنکھیں چاہے دیکھ نہ سکیں، پر روسکتی ہیں۔ آخر وہ لذیذ مرکب تیار ہوا۔ اس نے اس کو اتار کر نیچے رکھا۔ چولہے پر توا چڑھایا اور ہاتھوں سے روٹیاں بنا بنا کر سینکنے لگا۔ کتنا صحیح اندازہ تھا! روٹیاں سب یکساں تھیں۔ نہ چھوٹی نہ بڑی، نہ سیوڑی نہ جلی ہوئی۔ توے سے اتار اتار کر روٹیوں کو چولہے میں پکاتا تھا اور زمین پر رکھتا جاتا تھا۔ جب روٹیاں بن گئیں تو اس نے دروازہ پر کھڑے ہو کر زور سے پکارا ''مٹھو، مٹھو! آؤ بیٹا کھانا تیار ہے'' مگر جب مٹھو نہ آیا تو اس نے پھر دروازہ پر ٹٹی لگائی اور نائیک رام کے برآمدہ میں جا کر مٹھو کو پکارنے لگا۔ مٹھو وہیں سو رہا تھا۔ آواز سن کر

چونکا 12,13 سال کا خوب صورت اور خندرو لڑکا تھا۔ بھرا ہوا جسم سڈول ہاتھ پاؤں، یہ سورداس کا بھتیجا تھا۔ اس کے ماں باپ دونوں طاعون میں مر چکے تھے۔ تین سال سے اس کی پرورش و پرداخت کا بار سورداس ہی پر تھا۔ وہ اس کو جان سے زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ وہ خود چاہے فاقہ کرے مگر مٹھو کو ہر روز تین مرتبہ ضرور کھلاتا تھا۔ خود مٹر چبا کر رہ جاتا مگر اس کو شکر اور روٹی کبھی گھی اور نمک کے ساتھ روٹیاں کھلاتا تھا۔ اگر کوئی بھیک میں مٹھائی یا گڑ دے دیتا تو اس کو بڑی احتیاط سے اپنے انگوچھے کے گوشہ میں باندھ لیتا اور مٹھو کو دیتا سب سے کہتا ''یہ کمائی بڑھاپے کے لیے کر رہا ہوں ابھی تو ہاتھ پیر چلتے ہیں۔ مانگ کھاتا ہوں جب اٹھ بیٹھ نہ سکوں گا تو لوٹا بھر پانی کون دے گا؟ مٹھو کو سوتا پا کر گود میں اٹھالیا اور جھونپڑی کے دروازہ پر اتارا۔ پھر دروازہ کھولا اس کا منہ دھلوایا اور سامنے گڑ اور روٹیاں رکھ دیں۔ مٹھو نے روٹیاں دیکھیں تو مچل کر بولا میں روٹی اور گڑ نہ کھاؤں گا یہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا۔''

سورداس: بیٹا! بہت اچھا گڑ ہے، کھاؤ تو دیکھو کیسی نرم نرم روٹیاں ہیں گیہوں کی ہیں

مٹھو: میں نہ کھاؤں گا

سورداس: تو کیا کھاؤ گے بیٹا؟ اتنی رات گئے اور کیا ملے گا؟

مٹھو: میں تو دودھ روٹی کھاؤں گا

سورداس: بیٹا! اس وقت کھالو میں سویرے دودھ لا دوں گا

مٹھو رونے لگا سورداس اسے بہلا کر تھک گیا تو اپنے نصیبوں کو روتا ہوا اٹھا لکڑی اٹھائی اور ٹٹولتا ہوا بجرنگی اہیر کے گھر آیا جو اس کی جھونپڑی کے پاس ہی تھا بجرنگی کھاٹ پر بیٹھا ناریل پی رہا تھا۔ اس کی بیوی جمنی کھانا پکاتی تھی۔ صحن میں تین بھینسیں اور چار پانچ گائیں چری پر بندھی ہوئیں چارا کھا رہی تھیں۔ بجرنگی نے کہا ''کہو سورداس! کیسے چلے؟ آج بگھی پر کون لوگ بیٹھے ہوئے تم سے باتیں کر رہے تھے؟''

سورداس: وہی گودام کے صاحب تھے۔

بجرنگی: تم بہت دور تک گاڑی کے پیچھے دوڑے۔ کچھ ہاتھ لگا؟

سورداس: پتھر ہاتھ لگا! عیسائیوں میں بھی کہیں دیا دھرم ہوتا ہے۔ میری وہی زمین لینے کو کہتے ہیں۔

بجرنگی: گودام کے پیچھے والی نا؟

سورداس: ہاں وہی بہت لالچ دیتے رہے، پر میں نے ہاں نہیں کہا

سورداس نے سوچا تھا کہ ابھی کسی سے یہ بات نہیں کہوں گا لیکن اس وقت دودھ لینے کے لیے کچھ خوشامد ضروری تھی۔ اپنا تپاگ دکھا کر سرخرو بننا چاہتا تھا

بجرنگی: تم ہاں بھی کرتے تو یہاں کون اسے چھوڑے دیتا تھا؟ تین چار گاؤں کے بیچ میں یہی تو اتنی زمین ہے وہ نکل جائے گی تو ہماری گائیں اور بھینسیں کہاں جائیں گی؟

جمنی: میں تو انہیں کے دروازہ پر ان کو باندھ آتی

سورداس: میری جان نکل جائے تب تو بیچوں ہی گا نہیں ہزار پانچ سو کس گنتی میں ہیں؟ بہو جی! ایک گھونٹ دودھ ہو تو دے دے۔ مٹھوا کھانے بیٹھا ہے۔ روٹی اور گڑ چھوتا ہی نہیں۔ بس دودھ دودھ کی رٹ لگائے ہوئے ہے۔ جو چیز گھر میں نہیں ہوتی، اس کے لیے ضد کرتا ہے۔ دودھ نہ پائے گا تو بغیر کھائے ہی سو رہے گا

بجرنگی: لے جاؤ دودھ کی کون کمی ہے؟ ابھی دوہا ہے گھیسو کی ماں! ایک کلھیا دودھ دے دو سورداس کو

جمنی: ذرا بیٹھ جاؤ سورداس! ہاتھ خالی ہو تو دوں

بجرنگی: وہاں مٹھو کھانے بیٹھا ہے تو کہتی ہے ہاتھ خالی ہو تو دوں۔ تجھ سے نہ اٹھا جائے تو میں آؤں۔

جمنی جانتی تھی کہ یہ حضرت اٹھیں گے تو پاؤ کے بدلے آدھ سیر دلے ڈالیں گے۔ جھٹ رسوئی سے نکل آئی۔ ایک کلھیا میں پانی لیا۔ اوپر سے دودھ ڈال کر سورداس کے پاس لائی اور لاآزارانہ میل کے لہجہ میں بولی ''یہ لو! اس لونڈے کی زبان تم نے ایسی بگاڑ دی

ہے کہ بنا دودھ کے کورہی نہیں اٹھاتا۔ باپ جیتا تھا تو پیٹ بھر چنے بھی نہ ملتے تھے۔ اب دودھ کے بنا کھانے ہی نہیں اٹھا۔''

سورداس: کیا کروں بھائی؟ رونے لگتا ہے تو ترس آتا ہے۔

جمنی: ابھی اس طرح پال پوس رہے ہو کہ ایک دن کام آئے گا، مگر دیکھ لینا جو چلو بھر پانی کو بھی پوچھے۔ میری بات گانٹھ باندھ لو پرایا لڑکا کبھی اپنا نہیں ہوتا۔ ہاتھ پاؤں ہوئے اور تمہیں پھٹکار کر الگ ہو جائے گا تم اپنے لیے سانپ پال رہے ہو۔

سورداس: جو کچھ میرا دھرم ہے کیے دیتا ہوں۔ آدمی ہوگا تو کہاں تک نہ جس مانے گا۔ ہاں اپنی تقدیر ہی کھوٹی ہوئی تو کوئی کیا کرے گا اپنے ہی لڑکے کیا بڑے ہو کر منہ نہیں پھیر لیتے۔

جمنی: کیوں نہیں کہہ دیتے۔ میری بھینسیں چرا لایا کرے؟ جوان تو ہوا کیا جنم بھر ننھا ہی بنا رہے گا؟ گھیسو ہی کا جوڑی دار تو ہے۔ میری بات گانٹھ باندھ لو۔ ابھی سے کسی کام میں نہ لگایا تو کھلاڑی ہو جائے گا۔ پھر کسی کام میں اس کا جی نہ لگے گا۔ ساری عمر تمہارے ہی سر پھلوریاں کھاتا رہے گا۔

سورداس نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ دودھ کی کلھیالی اور لاٹھی سے ٹٹولتا ہوا گھر چلا۔ مٹھو زمین پر پڑا سو رہا تھا۔ اس کو پھر اٹھایا اور دودھ میں روٹیاں مل کر اسے اپنے ہاتھ سے کھلانے لگا۔ مٹھو نیند سے گرا پڑتا تھا، لیکن لقمہ سامنے آتے ہی اس کا منہ خود بخود کھل جاتا تھا۔ جب وہ ساری روٹیاں کھا چکا تو سورداس نے اس کو چٹائی پر لٹا دیا اور ہانڈی میں سے اپنی پانچ میل کھچڑی نکال کر کھائی۔ پیٹ نہ بھرا تو ہانڈی دھو کر پی گیا۔ ازاں بعد مٹھو کو گود میں اٹھا کر باہر آیا۔ دروازہ پر ٹٹی لگائی اور مندر کی طرف چلا۔

یہ مندر ٹھاکر جی کا تھا۔ بستی کے دوسرے سرے پر، اونچی کرسی تھی۔ مندر کے چاروں طرف تین چار گز چوڑا گبوترا تھا۔ یہی محلّہ کی چوپال تھی۔ تمام دن یہاں دس پانچ آدمی لیٹے یا بیٹھے رہتے تھے۔ ایک پختہ کنواں بھی تھا۔ جس پر جگدھر نام کا ایک خوانچہ والا بیٹھا

کرتا۔تیل کی مٹھائیاں،مونگ پھلی، رام دانے کے لڈو وغیرہ رکھتا تھا۔راہ گیر آتے۔اس سے مٹھائیاں لیتے۔پانی نکال کر پیتے اور اپنی راہ چلے جاتے۔مندر کے پوجاری کا نام دیا گر تھا، جو اسی مندر کے قریب ایک کٹیا میں رہتے تھے۔ٹھوس ایشور کے پوجاری تھے۔ بھجنوں اور گانوں کو نجات کا ذریعہ سمجھتے تھے اور بلا مورت والی پوجا کو ڈھونگ کہتے تھے۔ شہر کے پرانے رئیس کنور بھرت سنگھ کے یہاں سے کچھ ماہوار وظیفہ مقرر تھا۔اسی سے ٹھاکر جی کا بھوگ لگتا تھا۔بستی سے بھی کچھ نہ کچھ مل ہی جاتا تھا۔بے لوث آدمی تھا۔لالچ چھو بھی نہیں گیا تھا۔صبر توکل کا پتلا تھا۔تمام دن ذکر الٰہی میں مصروف رہتا تھا۔مندر میں ایک چھوٹی سی سنگت تھی۔آٹھ نو بجے رات کو دن کے کام دھندے سے فارغ ہو کر چند خوش اعتقاد لوگ جمع ہو جاتے تھے اور گھنٹے دو گھنٹے بھجن گا کر چلے جاتے تھے۔ٹھاکر دین ڈھول بجانے میں مشاق تھے۔بجرنگی کرتال بجاتا تھا۔جگدھر کو طنبورہ میں کمال تھا۔نایک رام اور دیا گر سارنگی بجاتے تھے۔مجیرے بجانے والوں کی تعداد میں کمی بیشی ہو جایا کرتی تھی۔ جو اور کچھ نہ کر سکتا وہ مجیرا ہی بجاتا تھا۔سورداس اس مجلس کی ناک تھا۔ڈھول، مجیرے، کرتال، سارنگی، طنبورہ سبھی میں اس کو یکساں مہارت تھی اور گانے میں تو آس پاس کے کئی محلوں میں اس کا جواب نہ تھا۔ٹھمری، غزل سے اس کو رغبت نہ تھی۔کبیر، میرا، دادو، نماں پلٹو وغیرہ صوفیوں کے بھجن گاتا تھا۔اس وقت اس کا چہرہ خوشی سے کھلا جاتا تھا۔گاتے گاتے مست ہو جاتا۔تن بدن کی سدھ نہ رہتی۔سارے تفکرات و ترددات بھگتی کے اتھاہ ساگر میں ڈوب جاتے تھے۔

سورداس مٹھو کو لیے ہوئے پہنچا تو مجلس آراستہ ہو چکی تھی۔جملہ ارکان جمع تھے۔صرف میر مجلس کی کمی تھی۔سورداس کو دیکھتے ہی نایک رام نے کہا ''تم نے بڑی دیر کر دی۔آدھ گھنٹہ سے تمہاری راہ دیکھ رہے ہیں۔یہ لونڈا اسی طرح تمہارے گلے پڑا ہے۔کیوں نہیں ہمارے گھر سے کچھ مانگ کر اسے کھلا دیا کرتے؟''

دیا گر: یہاں چلا آیا کرے تو ٹھاکر جی کے پرشادہی سے پیٹ بھر جائے۔

سورداس: تمہیں لوگوں کا دیا کھاتا ہے یا کسی کا؟ میں تو بنانے بھر کو ہوں۔

جگدھر: لڑکوں کو اتنا سر چڑھانا اچھا نہیں۔ گود میں لادے پھرتے ہو جیسے کوئی ننھا سا لڑکا ہو۔ میرا ودیا دھر اس سے دو سال چھوٹا ہے۔ میں اس کو کبھی گود میں لے کر نہیں پھرتا۔

سورداس: بنا ماں باپ کے لڑکے ضدی ہو جاتے ہیں۔ ہاں کیا ہوگا؟

دیا گر: پہلے رامائن کی ایک چوپائی ہو جائے۔

حاضرین نے اپنے اپنے ساز سنبھالے۔ سرملا اور آدھ گھنٹہ تک رامائن ہوتی رہی۔

نائیک رام: واہ سوراس واہ! اب تمہارے ہی دم کا ظہور ہے۔

بجرنگی: میری تو کوئی دونوں آنکھیں لے لے اور یہ ہنر مجھے دے دے تو میں خوشی سے بدل لوں۔

جگدھر: ابھی بھیرو نہیں آیا۔ اس کے بنا رنگ نہیں جمتا۔

بجرنگی: تاڑی بیچتا ہوگا۔ پیسہ کا لالچ برا ہوتا ہے۔ گھر میں ایک عورت ہے اور ایک بڑھیا ماں، پر رات دن ہائے ہائے پڑی رہتی ہے۔ کام کرنے کو تو دن ہے ہی۔ بھلا رات کو تو بھگوان کا بھجن ہو جائے۔

جگدھر: سورداس کا دم اکھڑ جاتا ہے۔ اس کا دم نہیں اکھڑتا۔

بجرنگی: تم اپنا کھونچہ بیچو۔ تمہیں کیا معلوم کہ دم کس کو کہتے ہیں؟ سورداس جتنا دم سادھتے ہیں اتنا کوئی دوسرا سادھے تو کلیجہ پھٹ جائے۔ کچھ ہنسی کھیل نہیں ہے۔

جگدھر: اچھا بھیا! سورداس کے برابر دنیا میں کوئی دم نہیں سادھ سکتا۔ اب خوش ہوئے؟

سورداس: بھیا اس میں جھگڑا کاہے کا؟ میں کب کہتا ہوں کہ مجھے گانا آتا ہے؟ تم لوگوں کا حکم پا کر جیسا بھلا برا بنتا ہے، سنا دیتا ہوں۔

اتنے میں بھیرو بھی آ کر بیٹھ گیا۔ بجرنگی نے طنز سے کہا ''کیا اب کوئی تاڑی پینے والا نہیں تھا؟ اتنی جلد دکان کیوں بڑھا دی؟''

ٹھاکر دین: معلوم نہیں ہاتھ پیر بھی دھوئے ہیں یا وہاں سے سیدھے ٹھاکر جی کے مندر میں چلے آئے۔ اب صفائی تو کہیں رہی نہیں گئی۔

بھیرو: کیا میری دیہہ میں تاڑی پوتی ہوئی ہے؟

ٹھاکر دین: بھگوان کے دربار میں اس طرح نہ آنا چاہیے۔ ذات چاہے اونچی ہو یا نیچی پر صفائی چاہیے ضرور۔

بھیرو: تم یہاں روز نہا کر آتے ہو؟

ٹھاکر دین: پان بیچنا کوئی نیچ کام نہیں ہے۔

بھیرو: جیسے پان ویسے تاڑی، پان بیچنا کوئی اونچا کام نہیں ہے۔

ٹھاکر دین: پان بھگوان کے بھوگ کے ساتھ رکھا جاتا ہے۔ بڑے بڑے جنیو دھاری میرے ہاتھ کا پان کھاتے ہیں۔ تمہارے ہاتھ کا تو کوئی پانی نہیں پیتا۔

نایک رام: ٹھاکر دین! یہ بات تو تم نے بڑی کھری کہی۔ سچ تو ہے۔ پاسی سیکوئی گھڑے تک نہیں چھواتا۔

بھیرو، ہماری دکان پر ایک دن آ کر بیٹھ جاؤ تو دکھا دوں کہ کیسے کیسے دھرماتما اور مہاتما آتے ہیں۔ سادھو مہاتماؤں کو بھی کسی نے پان کھاتے دیکھا ہے۔ تاڑی، گانجہ، چرس پیتے ہوئے جب چاہے دیکھ لو۔ ایک سے ایک مہاتما آ کر خوشامد کرتے ہیں۔

نایک رام: ٹھاکر دین! اب اس کا جواب دو۔ بھیرو پڑھا لکھا ہوتا تو وکیلوں کے کان کاٹتا۔

بھیرو: میں تو بات سچی کہتا ہوں، جیسے تاڑی ویسے پان، بلکہ پرات کی تاڑی کو تو لوگ دوا کی طرح پیتے ہیں۔

جگدھر: یارو! دوا ایک بھجن ہونے دو۔ مان کیوں نہیں جاتے۔

ٹھاکر دین: تمہیں ہارے، بھیرو جیتا سہی، چلو چھٹی ہوئی۔

نایک رام: واہ ہار کیوں مان لیں؟ ساستر ارتھ ہے کیوڑہ اور گلاب کی خوشبو اڑتی